اس کا قیمتی اور خوب صورت کپڑے پہننا بھی عبادت ہے اور اگر وہ قیمتی کپڑے اپنی برتری کے اظہار اور تکبر کرنے اور اترانے کے لئے یا پرائی عورتوں کے لبھانے کے لئے پہنے تو اس کا قیمتی کپڑے پہننا بھی گناہ ہے اور باعث عذاب ہے۔

غرض ہر مباح کام کے دو پہلو ہیں اگر وہ نیک نیت سے ہو تو وہ مستحب اور سنت ہے اور اگر وہ مباح کام برائی کی نیت سے ہو تو مکروہ یا حرام ہے اس لئے محققین نے کہا ہے کہ مباح الگ سے کوئی حکم شرعی نہیں ہے وہ ان ہی دس قسموں میں سے کوئی ایک قسم بن جاتا ہے اور مومن کامل کا کوئی فعل مباح نہیں ہوتا ہر فعل مستحب یا سنت ہوتا ہے اور فاسق اور بدچلن کا بھی کوئی فعل مباح نہیں ہوتا اس کا ہر فعل مکروہ یا حرام ہوتا ہے۔ احکام شرعیہ کی تعداد، انکی تعریفات انکے احکام انکی مثالیں اور ان کے دلائل پر ہم نے بہت مفصل گفتگو کی ہے اور شاید کہ قارئین کرام کو احکام شرعیہ کی اس قدر تفصیل اور تحقیق کسی اور جگہ نہیں مل سکے گی۔

مقالہ نگاروں کے لئے خصوصی ہدایات واطلاعات

۱۔ مقالات علمی، فکری اور تحقیقی نوعیت کے ہونے چاہئیں۔

۲۔ مقالات فل اسکیپ سائز کے اوراق پر کاغذ کے صرف ایک طرف، خوش خطی سے لکھے جائیں۔

۳۔ کمپوزڈ مقالے، مع سی ڈیز کے قابل ترجیح ہوں گے۔

۴۔ بہتر ہوگا کہ مقالہ کی اصل کاپی کے ساتھ، دو عدد نقول بھی ارسال فرمائیں۔

۵۔ تمام مقالات ریفریز کی مثبت رپورٹ کے بعد شائع کیئے جائیں گے۔

۶۔ مقالہ نگار حضرت پہلے سے شائع شدہ مضامین ومقالات ہرگز نہ بھیجیں ورنہ ان کے مضامین کی اشاعت، آئندہ کے لئے روک دی جائے گی۔

خصوصی نوٹ:

مجلس تفسیر، بعض نامور علماء اور مشاہیر اساتذہ کے جو علمی فکری اور تحقیقی مضامین انتخاب کر کے شائع کرتی ہے۔ وہ دراصل علمی ودینی خدمت کے پیش نظر ایسا کرتی ہے۔ مجلس تفسیر سمجھتی ہے کہ نئے مگر غیر معیاری مضامین ومقالات سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ پرانے مگر معیاری مضامین شائع کیئے جائیں۔ ہمارے اس جذبہ کو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (انڈیا) نے اپنی مئی ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں سراہا ہے۔ مجلس اس تعریف پر ان کی شکر گزار ہے۔

بیمار قوم اور اسکا علاج

علامہ سید محمد ہاشم فاضل شمسی

سابق شیخ الادب، جامعہ اسلامیہ بہاولپور

سابق پرنسپل، علیمیہ انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، کراچی

امت مرحومہ جو خیر الامم ہے عقیدہ توحید کی امین ہے اس امانت داری کی رعایت سے شہیر الامم اور امنار عالم سے ملقب ہے چنانچہ اس گروہ امین کے آقا ومولی کا ایک لقب رسول امین ہے اور اللہ و رسول کے مابین پیغام رساں کا نام وخطاب جبریل امین ہے اور کعبہ عبادت کا محل وقوع بلد امین ہے۔ الغرض امت مسلمہ اپنی صفات، سرمایہ اور وسائل کے لحاظ سے امین ہے خیانت وعذر کا یہاں گذر نہیں۔

عقیدہ توحید اسلام کا راس المال اور متاع خاص ہے اور یہ امت مرحومہ ہر حیثیت سے دنیا و آخرت کی ساری عمارتیں توحید ہی کی اساس پر تعمیر کرتی ہے ہر فکر وعمل کی ابتداء بھی توحید ہے وسط بھی توحید ہے اور انتہا بھی توحید ہے تجسیم اور تشبیہ کی گنجائش اسلامی فکر میں نہیں نکلتی، چنانچہ ذات الٰہی کی توحید، صفات الٰہی کی توحید، حقوق الٰہی کی توحید، انبیاء مرسلین کی توحید، کتب الٰہیہ کی توحید، بنی آدم کی توحید، جس کو فطری مساوات بھی کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایسے ہمہ گیر وحدت خیز مذہب کے متبعین اگر آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کریں اور گروہ بندی وتحزیب اختیار کریں تو یقیناً مقام حیرت ہے اور سمجھنا چاہیے کہ عقیدہ توحید کے اثرات ان کے ظاہری معاشرت ومعاملات میں سست پڑ گئے ہیں دل سے توحید کے فوارے ابل کر ظاہر کو سیراب نہیں کر رہے ہیں یہ کہنا تو ذرا مشکل ہے کہ ایسے لوگوں کے دل انوار توحید کی مرکزیت کھو چکے ہیں اس لئے

خشک سوتوں میں نمی نہیں رہی دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے پھر ظاہری کیفیات سے امراض باطنہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور مختلف جماعات وافراد کے باہم نزاع کو دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے دلوں میں توحید کے جلوے ماند پڑ گئے ہیں اور اسی بیماری کا اثر ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے دست وگریباں ہو جاتا ہے۔

تشخیص مرض اور اسکا علاج

مرض تو خلاف طبیعت غیر معتدل کیفیات کا نام ہے اور مسلمانوں میں یہ بے اعتدالی موجود ہے جس کی وجہ سے ہم پوری ملت کو مریض و بیمار کہہ سکتے ہیں سوال یہ ہے کہ اس مرض عام وبائے عام کا علاج کیا ہے اور تمام ملت دوبارہ صحت وصحو کیونکر حاصل کر سکتی ہے۔

تجویز علاج سے پیشتر اسباب مرض کی تحقیق وتفتیش ضروری ہے جب تک قومی بیماری کا سبب دریافت نہ ہو جائے ممکن ہے تریاق بھی زہر کا اثر پیدا کرے اور بیماری زیادہ الجھ جائے۔

مفکرین کی رائے

ملت اسلامیہ کی تباہی کا درد ہر مسلمان کو ہے۔ علماء، صناع، سیاس اور عوام سبھی اس غم میں مبتلا ہیں کہ اس قوم کا روگ معلوم کریں اور صحیح علاج سے اقوام عالم کے مقابلہ میں اس کو زیادہ صحت مند اور قوی تر بنادیں۔ مگر صدیوں تک مسلسل کوششوں کا نتیجہ یہی ہے کہ مرض بڑھتا جاتا ہے اور مریض کی صحت یابی دشوار تر ہوتی جاتی ہے۔

اسباب مرض کے متعلق لوگوں کی رائیں مختلف ہیں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس قومی تباہی کی علت مسلمانوں کا عمومی افلاس وغربت ہے لیکن ہم اس رائے سے متفق نہیں کیونکہ مسلمانوں میں صرف غرباء ہی نہیں بستے ہیں بلکہ بڑے بڑے دولت مند بھی ہیں اور دنیا کی عام اقتصادی گردش کے مطابق ایک نیا شخص دولت مند بن کر ابھرتا ہے اور دوسرا گرتا ہے اور دنیا میں کسی قوم کے تمام افراد مالدار نہیں ہوتے ہر قوم امیر وغریب کے مجموعہ کا نام ہے مگر جو تباہی مسلمانوں میں نظر آتی ہے وہ اوروں کے یہاں اس ہلاکت خیزی کے ساتھ نہیں ہے اس کے علاوہ قوموں کے عروج وزوال، صعود وہبوط اور ترقی وتنزل کی بنیاد سرمایہ دولت نہیں ہے خود اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ عہد رسالت اور اس کے قریبی زمانوں میں مسلمانوں کی جیبیں مال ودولت سے خالی تھیں اور جسے دنیا افلاس وفقر کہتی ہے مسلمان اس کے کامل نمونہ تھے پھر بھی ہمارے قومی عروج وارتقا کا وہی یادگار زمانہ ہے جس میں فقیر مسلمان دنیا کی تمام دولت مند اقوام پر غالب

آئے۔

اس لئے خود بے مائیگی کو ہم مسلم قوم کی تباہی کا سبب نہیں قرار دے سکتے بلکہ تجربات و واقعات کی روشنی میں فقر مسلمانوں کے عروج وترقی کا سبب ہے، بشرطیکہ اغنیاء اپنا سرمایہ اسلام کی خدمت اور مسلمان بھائیوں کی اعانت میں خرچ کریں۔ تو پھر جس طرح غیر مسلح، فاقہ کش قلیل التعداد مسلمان بدر میں اپنے مقابل مسلح، دولت مند اور کثیر التعداد دشمنوں پر غالب آئے تھے آج بھی غالب رہیں گے اس لیے سرمایہ کی کمی وبیشی تباہی کی علت نہیں ہے نا کارہ دولت مندی بیماری کا اثر ہے۔

سیاسی ضعف

بعض مفکرین قومی تباہی کی علت اقتصادی بدحالی کے بجائے سیاسی بے تدبیری اور دور اندیشی کی کمی قرار دیتے ہیں اگر سیاست سے مراد صرف قومی بے تدبیری اور ملکی دور اندیشی کے علاوہ اس کے حدود خانہ داری سے لے کر انتظام مملکت تک وسیع ہیں تو یہی تو مسلمان قوم کی بیماری ہے اس کو بیماری کی علت کہنا درست نہیں اور اگر سیاست سے مراد صرف انتظام مملکت ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ روگ اصل میں انتظام مملکت کا لگا ہوا ہے اور مسلمان عوام اس خارجی تاثیر سے متاثر ہو کر تباہ ہیں اور یہ غلط ہے کیونکہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان صرف رعایا کی حیثیت سے آباد ہیں اور حکومت غیر قوموں کی ہے اس قسم کے خیالات کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن جہاں حکومت وعوام دونوں دعویداران اسلام ہوں حکومت کی بدنظمی کو قومی تباہی کی علت قرار دینا بے معنی ہے کیونکہ حکومت اگر جمہوری اور شورائی ہے تو قومی تباہی کے مجرم عوام ہیں جو اپنی رائے ومرضی سے مفسدوں کے ہاتھوں میں عنان مملکت دے دیتے ہیں۔ وہ پاگل مجرم نہیں ہے جو تلوار پا کر اپنی بے عقلی وجنون سے کسی کو قتل کر دے بلکہ مجرم اصل میں وہ شخص ہے جو پاگل کے ہاتھ میں مہلک ہتھیار دے دے۔ لہٰذا حکومت کی سیاسی وانتظامی بداعمالیاں عوام کی قومی بیماری کا نتیجہ ہیں۔

اور اگر حکومت شخصی وشہنشاہی ہے تو ایسی حکومت کا وجود ہی قومی تباہی کی یادگار ہے اور جب تک مسلم عوام اپنے انسانی حقوق فطری آزادی اور اسلامی مساوات کی پامالی پر راضی رہیں گے وہ اور تباہ ہوتے جائیں گے۔

بے ہنری وجہالت

کچھ اہل نظر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی بیماری کی علت ان کی بے ہنری وجہالت ہے ان

میں سائنسدانوں اہل صنعت اور دیگر علوم متداولہ کے جاننے والوں کی سخت نایابی ہے مگر یہ بھی کوئی معقول علت مرض نہیں کیونکہ آج صدیوں کی مسلسل کوششوں کے بعد بھی اقوام عالم علم وہنر میں کوئی قابل رشک معیار قائم نہ کرسکی، کسی ترقی یافتہ ملک کا اوسط فیصدی معیار علمی ایسا نہیں جس کی کمی مسلمانوں کی قومی بیماری کا سبب کہلائے برخلاف یہود جو دنیا میں مجموعی اعتبار سے بہت دولت مند اور بڑے علم والے ہیں قومی لحاظ سے چنداں باعزت وباعظمت قوم نہیں جب سے یہودیوں پر ذلت اور مسکنت کی مہر لگادی گئی اور ان کی اپنی مذہبی کتاب میں قومی تباہی کا ابدی اعلان کردیا گیا اور اس مضمون کو قرآن مجید نے ایک ترمیم کے ساتھ دہرایا ہے یہود قومی لحاظ سے بادقعت نہیں ہیں کتاب یسعیاہ جو موجودہ یہودی بائبل کا بڑا اہم حصہ ہے یہودیوں کی ابدی پامالی کا اعلان کرتی ہے اور ان کی دائمی ذلت ومسکینی کی خبر رساں ہے قرآن حکیم نے بھی بنی اسرائیل کی اس ذلت ومسکنت کا بحوالہ کتب قدیمہ اعلان تو کردیا مگر ساتھ ہی یہ ایک ترمیم کا اپنی طرف سے اضافہ کیا کہ الا بحبل من اللہ وحبل من الناس۔ انبیائے سلف کی نافرمانی وقتل کی وجہ سے بنی اسرائیل پر ذلت ومسکنت مسلط کردی گئی اور اب ان کا قومی وجود خدا پرستوں یعنی مسلمانوں کے سہارے سے قائم ہوسکتا ہے یا دوسرے لوگوں کے سہارے اور مدد سے دنیا جانتی ہے کہ آج حکومت اسرائیل امریکہ وبرطانیہ کی رہین منت ہے اور ان مسلمانوں کی در پردہ اعانت ہے جو انگریز و امریکہ کی خوشنودی کے لئے اسرائیل کی طرف سے خاموش ہیں قرآن مجید کے اس ترمیم شدہ اعلان کے بعد آج تک اس چودہ سو سال میں اسرائیلی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی اور اب تک بائبل کتاب یسعیاہ کی قدیم پیشین گوئی ہی کا ظہور تھا اگر حکومت اسرائیل نہ ہوتی تو قرآن مجید کی ترمیم بے معنی ہوجاتی لہٰذا رب العزت نے قرآنی ترمیم کی صداقت دنیا کے سامنے ظاہر کردی۔ کلام اللہ کا یہ ایک اعجاز ہے جس میں اب دنیا کی کوئی کتاب شریک نہیں ہے اہل مغرب عیسائی اسلام ومسلمان سے ایک طرف تو سخت عداوت رکھتے ہیں مگر دوسری طرف قدرت الٰہیہ انہی کے ہاتھوں سے قرآن کی تصدیق کراتی ہے لا الـــہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

خیر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی مسلمانوں میں علم وہنر کی کمی ان کی قومی بیماری کی کوئی معقول علت نہیں ہے نیز سوال یہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں تو علم وہنر کے خزینہ دار یہی مسلمان تھے اور قومی روگ لگا تو یہ چیزیں ان سے علیحدہ ہوتی گئیں لہٰذا علم وہنر کی کمی مرض کی علت نہیں ہے بلکہ بیماری کی کیفیات ہیں۔

قائدین وعلماء کی نافرمانی

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومی بیماری کی وجہ قائدین، زعماء، لیڈروں اور رہنماؤں کی نافرمانی اور توہین ہے۔ یہ بات تو سخت مضحکہ خیز ہے اس قوم نے اپنے منہ کے پیچھے چلنے کی جو مثال قائم کی ہے اور قوموں کی زندگی میں مشکل سے نظر آئے گی۔ تحریک خلافت پر مسلمان فدا ہوگئے اور قائداعظم کی ایک آواز پر کچھ کم دس کروڑ انسانوں نے اپنی گردنیں جھکادیں۔ لہٰذا لیڈروں کی اطاعت میں تو مسلم قوم اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ہاں اگر یہ کہیئے کہ اس قوم کو صائب الرائے اور خیر خواہ لیڈر ہمیشہ نہیں ملتے تو بات معقول ہے مگر ایسا کیوں ہے وجہ ظاہر ہے قوم کی لیڈری ان کے اپنے افراد کے سپرد ہوتی ہے بیمار قوم میں پیدا ہونے والا لیڈر اس روگ کے آکندہ کے اثرات سے بالکل محفوظ کیونکر رہے گا قائداعظم کی خیر خواہی مسلم ہے مگر اس کا کیا علاج کہ قیام پاکستان کے بعد اقتدار اعلیٰ کی کرسیوں پر ایسے لوگوں کو بٹھایا جو اپنے نظریات واعمال میں مسلم لیگ اور پاکستان کے مخالف اور برطانیہ کے حمایتی تھے یہ بڑی اندوہناک غلطی ہوئی جس کی وجہ مسلمانوں کی قومی بیماری ہے۔

ایک بڑی جماعت کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی بیماری کا سبب مذہب سے اعراض وروگردانی ہے دنیا کی باطل پرست اقوام بھی اپنے مذہب واہل مذہب کا بہت احترام کرتی ہیں اپنی معاشرتی زندگی میں ہزار بدکار ہوں لیکن اہل مذہب کے سامنے ان کی گردنیں احترام میں جھکی رہتی ہیں انگلستان میں اگرچہ مذہب وسیاست کے حدود علیحدہ ہیں۔ لیکن آج بھی اگر آرچ بشپ اپنی صلیب لئے مذہب کے نام پر باہر نکل آئے تو لاکھوں سر فضا میں اڑنے لگیں۔ اور ایوان حکومت کی اینٹ سے اینٹ بج جائے یہی حال پاپائے روم کا ہے مگر مسلمانوں میں علمائے دین کا کوئی مقام نہیں یہ اگر دین پر یا دینی عقیدہ پر قربان ہوجائیں تو قوم کھڑی تماشہ دیکھتی ہے۔

مثال کے لئے ایڈورڈ ہشتم اور ڈیوک آف ونڈسر کا واقعہ لوگوں کے ذہن میں ہنوز تازہ ہے آرچ بشپ نے شہنشاہ برطانیہ کو مسز سمپسن سے عہد مناکحت کی اجازت نہیں دی تو فرمانروائے برطانیہ کو حقوق حکمرانی سے محروم ہونا پڑا اس کے علاوہ اور بھی متعدد مثالیں ہیں جن میں آرچ بشپ کا فیصلہ اہل اقتدار اور فرمانروائے انگلستان کی اپنی رایوں پر غالب رہا۔

علمائے دین کی اہانت کی گرم بازاری کیوں ہے اگر اس کی وجہ علماء کا افلاس ہے تو یہ بڑی نامعقول بات ہے کیونکہ اسلام میں کرامت وذلت کی بنا مالداری وافلاس تو ہے نہیں دوسرے پورے سو سال تک عیسائیوں نے اسلام کو مٹانے کے لئے جو مختلف تدبیریں اختیار کیں ان میں علوم دینیہ کو بے سہارا

کرنا اور علماء دین کو فاقہ کش بنانا بھی تھا لیکن دین حق کو برقرار رکھنے میں عیسائی کیادیاں ناکام رہیں اور حق پرست گروہ تمام آفات ومصائب کو جھیلتا ہوا علوم نبویہ (علی صاحبہا علیہ الصلوۃ والسلام) ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچاتا رہا، سوال یہ ہے کہ اب تو عیسائی چلے گئے مگر علوم دین وعلمائے دین پر راہ معیشت کیوں بند ہے اور ان پر افلاس کیوں مسلط ہے ان پر معاشرت اور دفاتر حکومت کے دروازے کیوں نہیں کھولے جاتے نہ اہل اقتدار کو اس کا خیال ہے اور نہ مسلمان قوم کو کوئی فکر، یہ کیفیت بھی اسی قومی بیماری کی ہے جس میں مسلمان قوم بحیثیت مجموعی مبتلا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان عوام ناواقف ہیں اس لئے علوم دینیہ اور علمائے دین کی اہمیت نہیں سمجھتے تو یہ بالکل غلط ہے مسلمان عوام اسلام کے متعلق اتنا کچھ جانتے ہیں جو باطل پرست قوموں کے عوام نہیں جانتے بلکہ ان کے غیر مذہبی علم رکھنے والے گریجویٹ اور پی ایچ ڈی بھی اپنے مذہب سے ناواقف ہیں ایشیائی عیسائیوں کو جانے دیجئے بارہا یورپین عیسائیوں سے بھی سابقہ پڑا ہے۔

آپ ایک بات اور یاد رکھیے کہ آج اسلامی تصانیف رسائل مضامین کی اشاعت اور علماء و واعظین کی تقاریر کی جس قدر کثرت ہے پچھلے دنوں یہ کثرت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود مذہب سے بیگانگی اور لاپروائی جس شدت سے آج دیکھی جارہی ہے وہ گذشتہ ادوار میں نہیں تھی۔

غرض اس سلسلہ میں مسلمانوں کی تباہی وبربادی کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے وہ سب بیماری کے اثرات ہیں بیماری کے اسباب نہیں ہیں اور جب تک علت کی دریافت کے بعد معالجہ نہ ہو تباہی مسلط رہے گی۔

بیماری اور اسکا علاج

آپ سوال کریں گے کہ علت مرض اور اس کا علاج کیا ہے بفضلہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کی قومی بیماری کے اسباب ومعالجہ سے واقف ہیں لیکن محض تفریح طبع یا علمی دلچسپی کے لئے ان کا ذکر لایعنی اور فضول ہے اعلیٰ ترین ومجرب نسخے بھی دفع مرض کے لئے بیکار ہیں اگر مریض خود دفع مرض کا آرزومندانہ علاج سے دلچسپی اور نسخہ کے استعمال کی لگن نہ ہو واقعی اگر مسلمان قوم جماعتی لحاظ سے علاج کی طلبگار ہو اور ہمیں اس کا یقین آجائے تو ہم علت مرض اور نسخہ بتادینے کے لئے تیار ہیں جس سے صحت ضرور حاصل ہو گی۔

مگر اس معالجہ اور اعلان علاج سے پہلے حقیقی طلب معلوم کرنے کی شرط ہے کہ لوگ اپنے اپنے حلقے میں صحیح قومی واسلامی شعور پیدا کریں۔ مثلاً تجارت پیشہ حضرات کی مختلف تجارتی انجمنیں ہیں جو

ان کے کاروبار میں رہنما اور معاون ہوتی ہیں وہ لوگ اسی کے ساتھ ایک ایسی انجمن بھی بنالیں جو قومی و اسلامی بنیاد پر ان کے کاروبار کی نگراں ہو، لوٹ کھسوٹ، چور بازاری ملاوٹ اور احتکار (Hoarding) سے کوئی بڑے سے بڑا سرمایہ دار کیوں نہ بن جائے جب قومی بیماری بڑھ کر فتنہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے تو داخلی شورش یا خارجی دباؤ آگ بن کر سرمایہ اور سرمایہ داری کو خاکستر بنادیتی ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ ہولناک ہے۔

اسی طرح دفتروں کے ملازمین اور چپراسیوں کی جماعت اپنی جداگانہ انجمنیں بنائے ہوئے ہیں تاکہ اپنے حقوق کی حفاظت کرسکیں اگر ان انجمنوں کے ساتھ وہ لوگ ایک ایسی سوسائٹی بھی قائم کرلیں جو تمام اہل پیشہ کے اندر قومی شعور اور اسلامی احساس پیدا کرے تو اس کے اثرات خود ان کے اپنے حق میں مفید و باعث ترقی ہوں گے رشوت ستانی، سستی، کام چوری، افسروں کی شکایت، ماتحتوں کی تذلیل منافرت پیدا کرتی ہے اور ماحول کو بگاڑ دیتی ہے۔

عمال حکومت واہل اقتدار کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے یہ لوگ تو ہماری بیماری کے نچوڑ ہیں ان کا معالجہ بعد میں ممکن ہوگا۔ علمائے دین بہت بدنام ہو چکے باہمی آویزش نے ان کو اور بھی گرادیا جو لوگ علماء کی بے قدری کی وجہ ان کے باہمی نزاعات قرار دیتے ہیں وہ سراسر غلطی میں مبتلا ہیں یورپ کی تاریخ اور کلیسا کے واقعات کو یاد کیجئے کہ عیسائیوں کی مذہبی گروہ بندیوں نے کیا کیا ظلم توڑے اور کس کس طرح انسانیت کا گلا گھوٹنا چاہا۔ علمائے اسلام کے جھگڑوں میں ایسی تباہیوں کا اثر عشر عشیر بھی نہیں ہے مگر نادانی تو دیکھئے کہ بعض مسلمان جنہیں اپنی مغربی تعلیم پر ناز ہے عیسائی گروہ بندیوں اور اہل مذہب کے مظالم کو اسلام اور علمائے اسلام پر چسپاں دیتے ہیں اس کی وجہ قومی بیماری ہے۔

لہذا ہم علمائے دین سے مودبانہ عرض کرتے ہیں کہ ایسی تمام باتیں جن کا تعلق قرآن وسنت کی ظاہری نصوص سے نہیں ہے مدار تکفیر وتفسیق قرار نہ دیں اور مباہات کے متعلق افراد امت کو آزاد چھوڑ دیں تاکہ ہر شخص اپنی صوابدید اور پسند سے جو روش چاہے اختیار کرے۔

اہل سنت کے عقائد جو پچھلے مسلمہ کتابوں میں درج ہیں۔ جن کو ہر فریق دل سے قبول کرتا ہے آج بھی صرف انہیں پر اکتفا کیا جائے۔ ان کے خلاف کسی چیز کو ماننے اور قبول کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ مسلمان اہل سنت ہی حقیقی معیار ہدایت ہیں۔

متکلمین علماء کی ادھر ادھر کی تحریروں کو ان کی اپنی ذمہ داری کے سپرد کردیا جائے اس طرح مختلف گروہوں میں اتحاد ممکن ہوگا اور تمام علماء مل کر اسلام کی کشتی کو تباہی کے بھنور سے نکال سکیں گے خدمت

دین کا جذبہ پیدا کریں اور جماعت سازی سے تائب ہوں لیڈروں سے گذارش ہے کہ قیادت کا بوجھ اٹھانے اور اسمبلی کی رکنیت اختیار کرنے کے بدلے عوام میں سیاسی شعور پیدا کریں۔

طلبہ کی انجمنیں ہیں یہ ان انجمنوں کے ساتھ ایک ایسا ادارہ بھی بنالیں جس کے ذریعہ سے وہ اپنے نظریات واعمال کو قومی واسلامی سانچہ میں ڈھال سکیں تو یہ طریقہ کار نہ صرف ان کی اپنی موجودہ زندگی کے لئے کارآمد ہے بلکہ قوم کی آئندہ تشکیل میں بھی مفید کارآمد، یہ لوگ عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی درستی سے آئندہ نسل درست ہو سکے گی۔

اسکول وکالج کے اساتذہ کی بھی انجمنیں ہیں اگر ان انجمنوں کے اغراض ومقاصد میں یہ ایک دفعہ بڑھالیں جس کی رو سے ان کی نظری وعلمی اصلاح، قومی واسلامی اساس پر ہو تو بحیثیت مجموعی قومی بیماری کا علاج آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ یہی لوگ اپنے قومی چاک پر تعلیم یافتہ دماغ گھڑتے ہیں۔

اصلاح نظر

جس طرح انفرادی زندگی اور اس کی تزئین وآرائش کے لئے تین امور بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ذاتی صلاحیت ۲۔بہتر ماحول ۳۔مناسب سعی

اسی طرح قومی اصلاح وبرتری کے لئے بھی تین چیزیں بنیادی ہیں۔

۱۔قومی شعور ۲۔جماعتی خیر خواہی ۳۔مشترک کوشش

مذکورہ باتوں میں سے جو چیزیں جس حد تک ناقص یا ناپید ہوں گی قومی عروج کی منزل اسی تناسب ومعیار سے دور ہوتی جائے گی۔

بدقسمتی سے مسلمان قومیت کے ان تینوں ترکیبی عناصر سے محروم ہیں نہ ان میں صحیح قومی شعور ہے نہ جماعتی خیر خواہی کی کوئی علامت نظر آتی ہے اور نہ مشترک کوشش کا نشان ہے۔ حالات کا غائر مطالعہ اور موجودہ مسلمانوں کی نفسیاتی تحلیل سے ظاہر ہے کہ ان کا خیال ومطمح نظر یکسر بدلا ہوا ہے جب تک اس غلط نظری کی اصلاح نہ ہوگی اس قوم کی دوبارہ اپنے مرکز کی طرف مراجعت ناممکن ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان پیدائش سے موت تک اسلام کے ظاہری ہدایات پر عمل کرتے ہیں جہاں جاتے ہیں دیکھتے ہی دیکھتے متعدد مسجدیں تعمیر ہو جاتی ہیں پنجگانہ نماز میں نمازیوں کی خاصی تعداد بہم ہوتی ہے رمضان میں روزہ داروں کی بھی معقول تعداد ہے مالدار زکوۃ وصدقات بھی ادا کرتے ہیں مدارس ومکاتب کی بنیادیں بھی پڑ جاتی ہیں۔ تجارت پیشہ حضرات صنعت وتجارت کے میدان میں دوڑ

لگاتے ہیں دفاتر حکومت میں بھی کچھ نہ کچھ دیانتدار افراد پائے جاتے ہیں۔ پارلیمان اور کابینہ میں بھی غدار وخود غرض نہیں ہوتے مگر کیا وجہ ہے کہ قوم بروں کے مآل کار سے برابر متاثر ہوتی جاتی ہے اور نیکو کاروں کے اثرات نتیجہ خیز نہیں ہوتے صالحین کے طفیل میں بدکاروں کی اصلاح کیا ہوتی یہاں تو ہر شعبہ زندگی ومیدان عمل میں بدی کا غلبہ ہے۔

تبدیلی نظر

اسی نفسیاتی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ جب اللہ بزرگ وبرتر کسی قوم کو برباد کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے ان کی عقل بے کار کر دی جاتی ہے چنانچہ قدیم وجدید اقوام کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایک ترقی یافتہ ملت کا سفر زوال بے عقلی کے نقطہ سے شروع ہوتا ہے یعنی زوال پذیر قوم نہ تو کسی آسمانی، زمینی یا موسمی آفت سے اچانک مفلس وقلاش ہو جاتی ہے نہ اس کے تمام رجال کار سیاسی، علماء، اصناع، جنرل وغیرہ کسی وبائی مرض سے ایک ساتھ مر جاتے ہیں۔

بلکہ انسانی خصوصیات وصلاحیتیں افراد میں جداگانہ طور پر علی حالہ قائم وبرقرار رہتی ہیں۔ علم وعمل کے ہر شعبہ میں تباہ شدہ قوم کے لوگ اعلیٰ ومتوسط معیار پر مشغول نظر آتے ہیں فرق یہ ہوتا ہے کہ افراد قوم کی صلاحیتیں جو پیشتر اپنی ہی قوم کی تعمیر میں صرف ہوتی تھیں وہ اب کسی اور غالب قوم کے تفوق وبرتری کا ذریعہ بن جاتی ہیں مثلاً برطانوی دور اقتدار میں ہندوستان ہمیشہ اچھے صنعت کار وصاحب قلم پیدا کرتا رہا اور مایہ ناز فوج بھی مہیا کرتا رہا مگر ہر کامیابی کا انجام تاج برطانیہ میں چند اور لعل وجواہر کا اضافہ تھا اور برطانوی قوم کی دولت وسرمایہ کی افزونی تھی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے

اس تباہی کی وجہ صرف ایک ہے ساری ملت کا نقطہ نظر انفرادی واجتماعی لحاظ سے بالکل بدل جاتا ہے خیر وشر اور نفع ونقصان میں تمیز باقی نہیں رہتی ان کی عقلیں اس حد تک ماؤف ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے کسی عمل کا مآل کار نہیں دیکھ سکتے۔ جس طرح ایک جانور کی نگاہ چراگاہ میں ایک محدود فاصلہ تک کام کرتی ہے ماضی کے واقعات اور مستقبل کے نتائج بہائم کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور دونوں کے درمیان کوئی ربط وسلسلہ نظر نہیں آتا یہی حال کسی زوال پذیر ملت کا ہوتا ہے وہ ماضی سے ناآشنا مستقبل سے غافل ہو کر بتدریج قومی شعور واحساس سے نابلد ہو جاتی ہے۔

کیا عقل کا ناکارہ پن اور نظر کی کوتاہی بے سبب عذاب الٰہی ہے جو محض اظہار اقتدار کے لئے

کسی قوم پر مسلط ہوتا ہے قرآن اس کا جواب نفی میں دیتا ہے اور انسانیت کی تاریخ بھی اعلان خداوندی کی تصدیق کرتی ہے۔

قوم جب خود اپنی حالت بدلنا شروع کرتی ہے تو فطرت کا سلوک بھی انہیں تغیرات کے مطابق ہوتا ہے گری ہوئی ملت ترقی کی طرف قدم بڑھائے تو فطرت دستگیری کرتی ہے اور کوئی ترقی یافتہ قوم بلندی سے اترنا چاہے تو فطرت اس کا راہ نہیں روکے گی مگر قومی بیماری، نقطہ نظر کا تغیر اور عقل کی ناکارگی کی ابتداء قوم کے بلند نشین طبقے سے شروع ہوتی ہے۔

اہل اقتدار اگر قومی امانت یعنی حکومت کو ذاتی، موروثی ملکیت بنانا چاہیں علماء پندار و برتری میں مشغول ہوں سرمایہ دار طبقہ عوام کی طرف سے آنکھیں پھیر لے تو پھر وہ نگاہ جس کی وسعت پوری ملت کو محیط تھی رفتہ رفتہ اپنے گرد و پیش میں محصور ہو جاتی ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں انسانی نگاہ حیوانی نظر کے سانچے میں ڈھل کر حیوانیت اختیار کر لیتی ہے اور جانوروں کی طرح اس انسانی معاشرہ کو دوسرے لوگ اپنی خدمت گذاری کے لئے مملوک و غلام بنا لیتے ہیں۔

تکبر و خود غرضی

الغرض کسی ترقی یافتہ ملت کی تباہی کے لئے مہلک جراثیم صرف دو ہیں۔ ایک باہمی تکبر دوسرے خود غرضی۔ جب کسی قوم کے بالانشین افراد کے دل ذاتی غرض اور ذاتی برتری یعنی تکبر سے پاک رہتے ہیں۔ اور ہر شخص ناپائیدار و عارضی مراتب کے فرق سے قطع نظر ہو کر ملت کے دوسرے تمام افراد کے برابر اپنے آپ کو سمجھتا رہے گا اور تمام ابنائے قوم کے دوش بدوش قومی ذمہ داریاں سنبھالے گا برتری و کمتری کے تصورات مٹا کر صحیح مساوات اختیار کرے گا ممکن نہیں ہے کہ اس کی قوم پست و ذلیل ہو سکے اور جس تناسب سے خود غرضی و تکبر کے جراثیم پیدا ہوں گے اسی معیار سے قومی پستی و ترقی کا اندازہ ہوتا جائے گا۔

چنانچہ آج بھی ماشاء اللہ نمازیوں کی ظاہری تعداد خوش کن ہے دنیا کی دوسری قوموں کے لوگوں کے مقابلہ میں مسلمان عبادت گذار پھر بھی زیادہ ہیں مگر نماز کی دینی غرض کا حال تو خدا کو معلوم ہے جہاں تک ظاہری اثرات کا تعلق ہے پنجگانہ اجتماع کے بعد بھی ان میں باہم اخوت و مساوات اور قومی یگانگت مفقود ہے طبقاتی اختلاف کا انداز نمایاں ہے برتری و کمتری، تکبر و تحقیر کی بیماری صاف دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر طبقہ کے تمام افراد اپنی ذاتی غرض اور ذاتی برتری کے لئے کوشاں ہیں تجارت و صنعت والے جائز و ناجائز ذرائع سے زیادہ سے زیادہ دولت کی دھن میں لگے ہوئے ہیں، کیوں کہ دولت کی فراوانی ہی

دراصل ان کی بڑائی اور کرامت کا ذریعہ ہے اگر دولت نہ ہو تو تکمیل غرض اور تکبر کی گنجائش نہیں رہے گی۔ تجارت پیشہ افراد کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ انکے حرص مال سے قومی تباہی پیدا ہو رہی ہے دولت کی گردش رکتی ہے عوام بھوکوں مرتے ہیں غذائیات کی آمیزش مضر صحت اور جان لیوا ہے مسجدوں کی تعمیر میں للّٰہیت تو کیا ہوگی نخوت و خود غرضی کی اینٹیں مسجدوں کی بنیادوں میں رکھی ہوئی ہیں، مدارس دینیہ کے قیام کی غرض مذہبی دکانداری سے زیادہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ بانیان مدارس عموماً حقوق تولیت اپنی ذات اور ورثا میں محدود رکھتے ہیں اور وہ علوم و فنون جن سے خود نا آشنا ہیں اور سارے معاشرے کو ان کی ضرورت ہے اپنے مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل نہیں کرتے کیونکہ مستقبل میں حقوق تولیت کو خطرہ معلوم ہوتا ہے۔

زکوٰۃ و صدقات سے مالداروں کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ پس انداز دولت دراصل عوام کا حصہ ہے جو معاملہ کے الٹ پھیر سے ان کے پاس آ گئی ہے لہٰذا زکوٰۃ و صدقہ کے ذریعہ حق حقدار رسید پر عمل کر رہے ہیں بلکہ اس دینی و معاشرتی عمل کا مقصد بھی اپنی برتری کا احساس و اظہار ہوتا ہے۔

تبدیل نگاہ کا نتیجہ

جب کسی قوم و افراد قوم کا مطمع نظر بدل جاتا ہے اور جداگانہ طور پر ہر شخص کو خود غرضی و ذاتی برتری کا گھن لگ جائے تو پھر اس کی نگاہ میں اپنا دور عروج بھی نشان پستی نظر آتا ہے عقل کھونے اور نظر بدلنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جو قومی ترقی کے زمانہ میں ابنائے ملت کا سرمایہ افتخار تھی ذلیل و حقیر دکھائی دیتی ہے اور ان میں سے ہر بات کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور برائت ظاہر کی جاتی ہے۔

اپنے معلم تمدن، برطانیہ ہی کے رسم و رواج پر ایک نگاہ ڈالیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ تاج پوشی اور انتخاب صدر کے معاملات میں کیا کیا رسمیں ادا ہوتی ہیں مگر کسی ترقی یافتہ انگریز نے آج تک ان مراسم کا استخفاف اور توہین نہیں کی۔

چرچ سے سیاست الگ ہے مگر عوام و خواص کوئی بھی چرچ یا اس کی ہدایات کا مذاق نہیں اڑاتا۔ یہ اس لئے ہے کہ غیر قوموں میں شعور باقی ہے لیکن مسلمانوں کا نقطہ نظر بدلا ہوا ہے اپنی ہر بات بری معلوم ہوتی ہے اور غیروں کی نفسیات تک ان کی نگاہ کی رسائی نہیں۔

قومی ترقی کے لئے سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنا نقطہ نظر بدلنا ہوگا۔ خود غرضی تکبر کے بدلے قومی مفاد و ملی مساوات کا دم بھرنا ہوگا اور اپنی ہر چیز کی توقیر کرنی ہوگی جو کچھ چیزیں دور ترقی کی یادگار کے طور پر و راثتاً ملی ہیں ان سے محبت کرنا ہوگی پھر وہ منزل نظر آئے گی جس کی طرف پیش قدمی کا نام ترقی ہے۔

عید کا تاریخی پس منظر، عظمت اور فلسفہ

مفتی منیب الرحمٰن

چیرمین مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان

سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل (حکومتِ پاکستان)

روح کی لطافت، قلب کے تزکیہ، بدن ولباس کی طہارت اور مجموعی شخصیت کی نفاست کے ساتھ بصد عجز وانکسار وبغایت خشوع خضوع تمام مسلمانوں کا اسلامی اتحاد واخوت کے جذبے سے سرشار ہوکر رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ بندگی اور نذرانہ شکر بجالانے کا نام عید ہے۔

لفظ عید کے معنی اور وجہ تسمیہ

عید کا لفظ عود سے ماخوذ ہے جس کے معنی لوٹنا ہے۔ چونکہ یہ دن مسلمانوں پر بار بار لوٹ کر آتا ہے، اس لئے اس کو عید کہتے ہیں (بحوالہ لسان العرب مصنف علامہ ابن منظور افریقی) ابن العربی نے کہا کہ عید کو "عید" اس لئے کہتے ہیں کہ یہ دن ہر سال مسرت کے ایک نئے تصور کے ساتھ لوٹ کر آتا ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ مسرت اور خوشی کے دن کو عید، نیک شگون کے طور پر کہا جاتا ہے تاکہ یہ دن ہماری زندگی میں بار بار لوٹ کر آئے، جس طرح "قافلہ" کے معنی ہیں "لوٹ کر آنے والا" اہل عرب قافلہ کو بھی نیک شگون کے طور پر قافلہ کہتے ہیں۔ گویا اس کے پیچھے یہ آرزو اور تمنا کارفرما ہوتی ہے کہ جس مقصد کے لئے جارہا ہے اس میں کامیاب وکامران ہوکر عافیت اور سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر واپس آجائے۔ چونکہ رب تبارک وتعالیٰ اس دن اپنے مقبول اور عبادت گزار بندوں پر اپنی ان گنت نعمتیں اور برکتیں لوٹاتا ہے اس لئے اسے عید کہتے ہیں۔

عید، انسانی فطرت کا تقاضہ

سال میں چند ایام جشن، تہوار اور عید کے طور پر دنیا کی تمام اقوام وملل اور مذاہب میں منائے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر قوم، مذہب وملت کے لوگ اپنے ایام عید کو اپنے اپنے عقائد، تصورات، روایات اور ثقافتی اقدار کے مطابق مناتے ہیں، لیکن اس سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ تصور عید انسانی فطرت کا تقاضہ اور انسانیت کی ایک قدر مشترک ہے۔ مسلمان قوم چونکہ اپنی فطرت، عقائد ونظریات اور ملی اقدار کے لحاظ سے دنیا کی تمام اقوام سے منفرد وممتاز ہے۔ اس لئے اس کا عید منانے کا انداز بھی سب سے نرالا ہے، بقول علامہ اقبالؒ

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اور اقوام کی عید محافل ناؤ نوش ورقص وسرود بپا کرنے، دنیا کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھوجانے، مادر پدر آزاد ہوکر بدمستیوں میں ڈوب جانے، تمام اخلاقی اقدار کو تج دینے، نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کو فروغ دینے اور "آج یا پھر کبھی نہیں" کے مصداق ہوس نفس کا اسیر بن جانے کا نام ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں روح کی لطافت، قلب کے تزکیے، بدن ولباس کی طہارت اور مجموعی شخصیت کی نفاست کے ساتھ بصد عجز وانکسار خشوع وخضوع تمام مسلمانوں کے اسلامی اتحاد واخوت کے جذبے سے سرشار ہوکر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ بندگی اور نذرانہ شکر بجالانے کا نام عید ہے۔

قرآن مجید میں ذکر عید

قرآن مجید میں سورۂ مائدہ آیت: ۱۱۴ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دعاء کے حوالے سے عید کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قال عیسی ابن مریم اللھم ربنا انزل علینا مآئدہ من السمآ تکون لنا عید الاولنا واخرنا واٰیۃ منک ج وارزقنا وانت خیر الرازقین۔

"عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے اللہ! ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار دے (اور اس طرح اس کے اترنے کا دن) ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں، پچھلوں کے لئے (بطور) عید (یادگار) قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور ہمیں رزق عطا فرما اور تو بہترین رزق عطا فرمانے والا ہے"۔

اس سے اگلی آیت میں ارشاد خداوندی ہے:

قال اللّٰہ انی منزلھا علیکم ج فمن یکفر بعد منکم فانی اعذبہ عذابا لا اعذبہ احدا من العلمین (المائدہ:۱۱۵)

''اللہ نے فرمایا کہ میں یہ (خوان) تم پر اتار تو دیتا ہوں مگر اس کے بعد تم میں سے جو کفر کرے تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا جو سارے جہانوں میں اور کسی کو نہ دیا ہو''

رہا یہ سوال کہ دعائے عیسیٰ علیہ السلام کے نتیجے میں ان کی قوم پر یہ خوان اترا یا نہیں، قرآن نے اس سلسلے میں سکوت اختیار فرمایا ہے، البتہ تفاسیر میں دونوں طرح کی روایات موجود ہیں۔ ہمارے زیر بحث موضوع سے جو بات متعلق ہے وہ یہ ہے کسی قوم کے مسرت کے دن کا قرآن نے عید کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور جو دن کسی قوم کے لئے اللہ کی کسی خصوصی نعمت کے نزول کا دن ہو وہ اس دن کو اپنا یوم عید کہہ سکتی ہے۔

عید میلاد مصطفیٰ ﷺ کا ثبوت ایک لطیفہ پیرائے میں

مفسر قرآن مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ نے قرآن مجید کے اپنے تفسیری حاشیے ''خزائن العرفان'' میں اس مقام پر ایک لطیف نکتہ آفرینی کی ہے۔ وہ یہ کہ جب اللہ کی خصوصی نعمت کے نزول کا دن عید قرار پا سکتا ہے اور قرآن ایک طرح سے اس کی توثیق کر رہا ہے تو اگر امت محمد ﷺ اللہ کی نعمت عظمیٰ محمد ﷺ کی ولادت باسعادت کے دن کو ایک عید کے طور پر منائے تو اسمیں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے۔

اسلام میں عید کا آغاز

خالص اسلامی فکر اور دینی مزاج کے مطابق اسلامی تمدن، معاشرت اور اجتماعی زندگی کا آغاز ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں عیدین کا مبارک سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کا تذکرہ سنن ابی داؤد کی مندرجہ ذیل حدیث میں ملتا ہے۔ ''حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اہل مدینہ دو دن بطور تہوار منایا کرتے تھے جن میں وہ کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا'' یہ دو دن جو تم مناتے ہو'' ان کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے؟ (یعنی ان تہواروں کی اصلیت اور تاریخی پس منظر کیا ہے؟) انہوں نے عرض کیا کہ ہم عہد جاہلیت میں (یعنی اسلام سے پہلے) یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' اللہ

تعالیٰ نے تمہارے ان دونوں تہواروں کے بدلے میں تمہارے لئے ان سے بہتر دو دن مقرر فرما دیئے ہیں، یوم (عید) الاضحیٰ اور یوم (عید) الفطر''۔

عید کے ایام کو مقرر کرنے کی حکمت

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیوں نہیں کر دیا کہ نو روز اور مہرجان کے انہی تہواروں کی اصلاح فرما دیتے اور ان میں جو رسوم شرعی اعتبار سے منکرات کے زمرے میں آسکتی تھیں، ان کی ممانعت فرما دیتے اور اظہار مسرت کی جو جائز صورتیں تھیں وہ اختیار کرنے کی اجازت دے دیتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں اللہ کی حکمت کارفرما تھی۔ دراصل ہر چیز کا ایک مزاج اور پس منظر ہوتا ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں کسی چیز کو اس کے تخلیقی مزاج اور تاریخی پس منظر سے جدا نہیں کر سکتے، لہٰذا جس چیز کی اساس کسی شر پر رکھی گئی ہو اس کی کانٹ چھانٹ اور بناؤ سنگھار سے کوئی خیر پر مبنی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اور اسلام تو آیا ہی اس لئے ہے کہ کفر اور بدی کے اثرات کو مٹایا جائے۔ معلوم ہوا کہ اسلامی معتقدات اور خالص دینی فکر اور شرعی مزاج کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق تمام جاہلی رسوم اور کافرانہ شعائر سے یکسر ختم کر دیا جائے تاکہ عہد جاہلیت کی تمام علامات سے کٹ کر ان میں صحیح دینی فکر پیدا ہو سکے۔

چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے اس نے جہاں اپنے ماننے والوں کو لادینی نظریات سے محفوظ رکھا وہاں ان کے صحیح جبلی اور فطری تقاضوں کی آبیاری بھی کی، عید منانا انسانی فطرت کا تقاضہ تھا لہٰذا مسلمانوں کو ایک کی بجائے عیدین کی دوہری نعمت عطا فرمائی۔

یوم عید کے مستحبات

عید کے دن یہ امور مستحب ہیں: حجامت بنوانا، ناخن تراشنا، غسل کرنا، مسواک کرنا، خوشبو لگانا، اچھے صاف ستھرے یا دستیاب ہوں تو نئے کپڑے پہننا، صبح کی نماز مسجد میں پڑھ کر عیدگاہ چلے جانا۔

عیدگاہ جاتے وقت راستہ تبدیل کرنا

سنت یہ ہے کہ جس راستے سے عیدگاہ جائے، نماز پڑھ کر اس راستے کے بجائے دوسرے راستے سے گھر واپس جائے۔ بخاری شریف میں حدیث ہے:

''حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عید کے دن نبی اکرم ﷺ (عیدگاہ آتے

جاتے میں) راستہ تبدیل کرتے تھے"۔

اس کی متعدد حکمتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: دونوں راستے نمازی کی عبادت اور ذکر پر گواہی دیں، دونوں راستوں پر اسلامی شعار کا اظہار ہو اور دونوں راستوں پر بے نمازیوں اور اللہ کی عبادت سے غافل رہنے والوں کو اپنے عمل سے یاد خدا کی طرف مائل کیا جائے۔

ون وے ٹریفک کا نظریہ

اس کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک راستے سے جانے اور دوسرے راستے سے واپس آنے سے آنے جانے والوں کے لئے سہولت ہو، اژدہام اور بھیڑ میں کمی واقع ہو اور گزرگاہ تنگ نہ ہو۔ ہم بجا طور پر دنیا والوں کے سامنے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے جدید تمدن، معاشرت اور شہری زندگی کے مسائل کو اپنی تعلیمات کے ذریعے نہایت سہل انداز میں حل فرمایا ہے اور یہ کہ One Way Traffic کے اصولوں کے بانی ہمارے پیارے نبی ﷺ ہیں۔

عید نہ منانا

قوموں کی زندگی میں ایسے حوادث اور مصائب پیش آتے رہتے ہیں اور بدقسمتی سے گزشتہ برسوں سے اس طرح کے المناک واقعات ہماری روزمرہ زندگی کا ایک معمول بن چکے ہیں۔ ایسے حوادث کے پیش نظر اکثر اوقات بعض افراد یا حلقوں کی جانب سے یہ سننے میں آتا ہے کہ اس سال ہم عید نہیں منائیں گے۔ اس طرح کے بیانات کے پیچھے یقیناً نیک نیتی، حب الوطنی، اخوت اسلامی اور انسانیت دوستی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عید نہ منانے کا مطلب کیا ہے؟ یہ کوئی جشن یا تہوار تو ہے نہیں، یہ تو عبادت اور سنت مصطفی ﷺ ہے، اخوت اسلامی اور اتحاد امت کا مظاہرہ ہے، جمعیت قوم مسلم کا ایک حسین منظر ہے، اللہ کی بارگاہ میں دوگانہ نماز عید کی ادائیگی کا نام ہے۔ شرافت، متانت اور نفاست ایسی انسانی خصوصیات کا مظہر ہے ان میں سے کوئی چیز اور کوئی بات ایسی نہیں جو عسر و یسر اور رنج و راحت ہر حال میں منائے جانے کے قابل نہ ہو۔ باقی رہا لہو و لعب میں مشغولیت، رقص و سرود کی محافل برپا کرنا، ناؤ نوش اور محرمات شرعیہ کا ارتکاب اور ہوس نفس کی تسکین کے سامان بہم پہنچانا، یہ ایسے امور ہیں جن کا اسلامی تصور عید سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو ایک مسلمان کو نہ صرف عید کے مقدس موقع پر بلکہ زندگی کے ماہ و سال کے ہر لمحہ و لحظہ میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں بلکہ ان محرمات و منکرات شرعیہ کو چھوڑ نا ہی ایک مومن کامل کی حقیقی عید ہے اور ایسی عید اللہ تعالیٰ ہر بندۂ مومن کو نصیب فرمائے۔

Seminar Library
Department of Islamic History
University of Karachi

"الرسول النبی الأمّی" کا معنیٰ مرادی

محمد عارف خان ساقی

استاذ شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

نحمده و نصلّی و نسلم علی الرسول النبی الامی واٰله واصحابه وأمته اجمعین۔

قرآن مجید میں حضور رسالتمآب ﷺ کی ایک صفت "الرسول النبی الامّی" بیان ہوئی ہے۔ جس انداز سے قرآن حکیم نے آپ ﷺ کیلئے یہ کلمہ استعمال کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ امّی ہونا آپ ﷺ کا وہ امتیازی وصف ہے جس سے بنی اسرائیل کے انبیاء کرام اور رسولان عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام متصف نہیں ہوئے۔ اس معاملے میں اب تک ہمارے علماء کے درمیان یہ بحث چل رہی ہے کہ قرآن حکیم میں آپ ﷺ کے لئے الرسول النبی الامی کے کلمات کو ایک امتیازی وصف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے تو یہاں "امّی" سے کیا مراد ہے ؟ چنانچہ اس سلسلے میں علماء کے متعدد اور مختلف اقوال ہیں۔

یوں تو انبیاء کرام کو ان کے حالات و زمانہ اور معروضی ضرورتوں کے تحت فضائل و معجزات سے سرفراز فرمایا گیا اور یکسانی و مساوات کہیں نہیں پائی جاتی۔ ہر ایک کی اپنی خصوصیات ہیں اور ہر کسی کے اپنے امتیازات۔ مگر آپ ﷺ کا امی ہونا محض ایک امتیازی وصف ہی نہیں بلکہ نبی موعود کی شناخت و پہچان کی ایک علامتِ خاص بھی ہے۔ ایک ایسی علامت جس کے فہم پر نبی موعود کی پہچان اور شناخت موقوف ہے۔ علامت اور نشان کے درست تعین اور فہم کامل کے بغیر مقصود تک رسائی چونکہ ممکن نہیں ہوتی اس لیے اس کے فہم یقینی کا حصول اور درست تعین بادیٔ النظر میں ہی ہو جانا چاہئے تھا۔ چہ جائیکہ احتمالات

دامکانات کے دبیز پردوں میں اس کو چھپایا اور اقوال کی کثرت میں الجھا اور الجھایا جاتا۔ کیونکہ مقصود کی طرف راہنمائی کرنے والی علامات کو چھپانا یا مبہم رکھنا بنیادی مقصد اور حکمت کے خلاف ہوتا ہے۔

حضرت سیدنا موسیٰ علیہ وعلی نبینا افضل الصلوات والتسلیمات کی معیت میں بنی اسرائیل کے ستر افراد رب ذوالجلال کی ملاقات کیلئے جاتے ہیں۔ جب وہ سارے اللہ کی پکڑ میں آکر ہلاک ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توبہ واستغفار کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں دستِ دعا پھیلا دیئے۔ دعا قبول ہوئی اور جواب ملا:

قال عذابی اصیب به من اشآء ۚ ورحمتی وسعت کل شیء ؕ فسأکتبها للذین یتقون و یؤتون الزکوة والذین هم بأیٰتنا یؤمنون ۔الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التورٰة والانجیل (۱)

"جسے میں چاہوں گا عذاب سے دوچار کروں گا اور میری رحمت ہر چیز سے وسیع تر ہے۔ پھر عنقریب میں اسے ان لوگوں کیلئے لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور وہ جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ وہ لوگ کہ جو اس رسول و نبی امی کی پیروی کریں گے، جس کا ذکر اپنے پاس موجود تورات اور انجیل میں پائیں گے۔"

پھر گفتگو کا تسلسل برقرار رہتا ہے اور نبی امی کے خصائص کا ذکر آجاتا ہے۔ اس سے صاف مترشح ہے کہ امی ہونا اس نبی معظم کا شناختی وصف ہے جو نبی موعود ہے۔ آپ ﷺ سے متعلق بشارات کا سلسلہ حضرت ابوالانبیاء سیدنا خلیل اللہ علیہ وعلی نبینا افضل الصلوات والتسلیمات کی دعا سے شروع ہوتا ہے۔ تورات کے حوالے سے اس دعا کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ یہاں قرآن حکیم کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

ربنا وابعث فیهم رسولا منهم یتلوا علیهم اٰیٰتک ویعلمهم الکتٰب والحکمة ویزکیهم ؕ انک انت العزیز الحکیم (۲)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں خود انہی میں سے ایک عظیم المرتبت رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ فرما دے، تو بڑا ہی مقتدر اور بہت حکمتوں والا ہے۔

یہ دعا خانۂ کعبہ کی تعمیر کے عمل کے دوران مکہ مکرمہ میں مانگی گئی تھی۔ یہ چیز اس بات کا قرینہ ہے کہ جس نبی کی بعثت کی دعا مانگی گئی اس کی بعثت مکہ مکرمہ میں اور اہل مکہ ہی میں سے ہو۔ چنانچہ فہیم اور منصف انہی دو باتوں کا تعین ہو رہا ہے۔ آپ علیہ السلام کے ساتھ اس وقت چونکہ حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام خانۂ کعبہ کی تعمیر کے عمل میں شریک اور مصروف تھے اس لئے یہ دعا بھی آپ علیہ السلام کے حق میں ہوئی۔ مگر حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد اور آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے کے زمانوں میں نبوت و رسالت کا جو دور چلا وہ پورے کا پورا آپ علیہ السلام کے چھوٹے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس اثناء میں بنی اسماعیل پہ خاموشی طاری رہی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے عہد میں جس نبی موعود کی بعثت کی بشارت دیتے ہیں اس کی بنیاد وہ وحی الٰہی معلوم ہوتی ہے جس کا حوالہ متذکرہ بالا فرمان ایزدی سے ملتا ہے۔ اس موقع پر آپ علیہ السلام کو نبی موعود کی یہ علامت بتا دی گئی تھی کہ وہ "امی" ہوگا۔ اور آپ علیہ السلام کے بعد کوئی بھی اور نبی جو "امی" نہ ہوگا اس بشارت کا مصداق بھی نہ ہوگا۔ اس مسئلے میں علماء کرام کے اقوال میں جو تعدد اور گوناگونی پائی جاتی ہے اسی سے ان اقوال کی صحت و صداقت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جو موقف اختیار کیا اس میں ایک بے اعتدالی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ جس پہ از سر نو غور و خوض اور اس موقف سے گریز ضروری ہے۔ اس موقف کی صحت تسلیم کر لی جائے تو اس کلمے سے شان رسالت میں تنقیص کا پہلو نکلتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہاں نبی ﷺ کے لئے امی کا لفظ یہودی اصطلاح کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے۔ بنی اسرائیل اپنے سوا دوسری سب قوموں کو امی (گوئیم یا جنٹائل) کہتے تھے اور ان کا قومی غرور کسی امی کی پیشوائی تسلیم کرنا تو درکنار اس پر بھی تیار نہ تھا کہ امیوں کے لئے اپنے برابر انسانی حقوق ہی تسلیم کر لیں۔ چنانچہ قرآن میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "امیوں کے مال مار کھانے میں ہم پر کوئی مؤاخذہ نہیں" (آل عمران آیت ۷۵) پس اللہ تعالیٰ انہی کی اصطلاح استعمال کر کے فرماتا ہے کہ اب تو اسی امی کے ساتھ تمہاری قسمت وابستہ ہے۔ اس کی پیروی قبول کرو گے تو میری رحمت سے حصہ پاؤ گے ورنہ وہی غضب تمہارے لئے مقدر ہے جس میں صدیوں سے گرفتار چلے آرہے ہو۔" (۳)

سارے آثار و قرائن تو یہی بتاتے ہیں کہ یہ کلمہ یہود کی اختراع اور وضع کردہ اصطلاح ہے۔ اس حد تک تو مندرجہ بالا موقف درست اور حقائق کے موافق ہے۔ چونکہ یہود کا عیسائیوں کے مقابلے میں

جزیرہ نمائے عرب میں اثر و رسوخ زیادہ تھا اس لئے بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ امی کا لفظ غیر اہل کتاب کے معنی میں انہوں نے ہی استعمال اور رائج کیا۔ مگر عوامی سطح پر عام استعمال میں آ جانے والے ایک کلمے میں یہود کی مکروہ ذہنیت کے آثار تلاش کرنا اور اس کو ان کی کمتر سوچ سے آلودہ کر دینا قطعاً مناسب نہیں۔ زیر بحث آیت مبارکہ مکی سورت کا حصہ ہے۔ اگر ایسی کوئی آلودگی پائی جاتی تو یہ کلمہ کسی مکی سورت میں آپ ﷺ کی صفت کے طور پر شامل تو ہرگز نہ ہوتا کہ یہاں تو ابھی یہود کا سامنا ہی نہیں ہے۔ نہ ان کی زیر دستی یا بالا دستی کا سوال ہی ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے آپ ﷺ کے نام نامی اسم گرامی کو بگاڑ کر مذمم کہنے والوں کو چڑانے کے لئے وحیٔ الٰہی اس کلمے کو آپ ﷺ کا وصف ظاہر کرتے ہوئے یہ تاثر پیدا کرے کہ آج تم اسی مذمم کے رحم و کرم پر ہو۔ عیاذاً باللہ ! یہ پہلو دھیان میں ہوتا تو سید ابوالاعلیٰ مودودی یہ مؤقف یقیناً اختیار نہ کرتے۔ الغرض یہود یہ کلمہ غیروں کے لئے ضرور استعمال کرتے تھے مگر نفرت و حقارت کے اظہار کے لئے نہیں، جداگانہ شناخت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

''جو علم خدا کے نام کے بغیر ہو وہ انسانیت کی تباہی کا سبب بنے گا'' کے نام سے طبع ہو کر عام لوگوں کے استفادے کے لئے تقسیم ہونے والے ایک مختصر کتابچے میں سید ابوالحسن علی ندوی کا زور اس بات پر ہے کہ امی کا معنی ''ناخواندہ ہونا'' ہے:

''جس پر یہ وحی نازل ہو رہی ہے وہ خود بھی ناخواندہ امی ہے، اس کی پوری قوم ان پڑھ ہے، یہودیوں نے بھی ان کو امیین کے لقب سے پکارا ہے۔'' (۴)

پیر کرم شاہ الازہری کا بھی اس معاملے میں کوئی قول مختار نہیں۔ فرماتے ہیں: ''حضور ﷺ کو ''الامی'' کہنے کی متعدد توجیہات علماء کرام نے بیان کی ہیں'' پھر حسب ذیل توجیہات نقل کرتے ہیں:

۱۔ ''منسوب الی الام یعنی ھو علی ما ولدتہ امہ لم یکتب ولم یقرأ'' یعنی یہ کلمہ ام بمعنی ماں، کی طرف منسوب ہے۔ وہ شخص جو اسی حال پر ہو جس پر اس کی ولادت ہوئی کہ نہ لکھا نہ پڑھا۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) کی طرف نسبت کی وجہ سے امی کہا گیا۔

۳۔ بعض کی رائے ہے کہ کہ امی امت کی طرف منسوب ہے۔ یعنی حضور ﷺ صاحب اُمت ہیں۔ (۵)

لغت نویس کہتے ہیں:

''الامی من لا یعرف الکتابۃ ولا القرأۃ'' (۶) یعنی امی وہ ہے جو لکھنا جانتا ہو نہ پڑھنا۔

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

''الامی ھو الذی لا یکتب ولا یقرأ من کتاب'' (۷) یعنی امی وہ شخص ہے کہ جو کسی کتاب سے پڑھ سکتا ہو نہ لکھ سکتا ہو۔

علامہ جار اللہ زمخشری کے نزدیک امی سے مراد یہود بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایک مقام پر '' امیّون '' سے اَن پڑھ یہودی مراد لئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ومنھم أمیّون لا یحسنون الکتب فیطالعوا التوراۃ ویتحققوا ما فیھا (۸)

ترجمہ : اور ان میں سے کچھ اَن پڑھ ہیں، کتاب کے بارے میں بہتر معلومات نہیں رکھتے کہ تورات کا مطالعہ ہی کر سکیں اور یہ تحقیق کر سکیں کہ اس میں کیا کیا احکام ہیں۔

استاذی، علامہ غلام رسول سعیدی فرماتے ہیں:

''امی وہ شخص ہے جو لکھتا ہو نہ پڑھتا ہو، یعنی جس طرح ماں کے بطن سے ناخواندہ پیدا ہوا تھا اسی حالت پر ہو اور کسی سے علم حاصل نہ کیا ہو''۔ (۹)

ایک روایت میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ جب لکھا جانے لگا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا نام مبارک ''محمد رسول اللہ'' لکھ دیا۔ اس پر مشرکین مکہ معترض ہوئے کہ ہم آپ (ﷺ) کو اللہ کا رسول مانتے تو پھر جھگڑا ہی کیا رہ جاتا۔ اور اصرار کیا کہ ''رسول اللہ'' کے کلمات ہٹا دیئے جائیں۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ کلمات ہٹا دیں۔ مگر آپ رضی اللہ عنہ کو تامل ہوا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

أرنی مکانھا فأراہ مکانھا فمحاھا و کتب ابن عبداللہ (۱۰)

ترجمہ : مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں ''رسول اللہ'' کے کلمات لکھے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ جگہ دکھائی جہاں یہ کلمات لکھے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے ان کلمات کو مٹا کر ''ابن عبداللہ'' لکھ دیا۔

حضرات شارحین حدیث نے اس روایت کے ذیل میں بڑی طویل اور تفصیلی بحثیں درج کی